معیار: علمی وتحقیقی مجلّہ، شعبۂ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، جلد:۲، شمارہ:۲ جولائی-دسمبر ۲۰۱۰ء

# علامہ اقبال اور اتحادِ عالم اِسلامی

تحسین فراقی*

اگر یہ سوال کیا جائے کہ اقبال کی تمام شعری ونثری تحریروں اور خود ان کی سراپا دردمند و بے قرار زندگی کا خلاصہ اور ماحصل کیا ہے تو اسے ایک جملے میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے: ''ملتِ اسلامیہ سے بے پناہ عشق اور عالم اسلام کے اتحاد و یگانگت کی نامختتم آرزو'' انھوں نے جس تواتر سے اپنے پہلے شعری مجموعے سے لے کر ارمغانِ حجاز تک اور اپنی تقاریر، خطبات، مکتوبات اور مقالات میں اہلِ اسلام کے تاب ناک ماضی اور ان کے روشن مستقبل کی پیش قیاسی کی ہے اس میں اردو فارسی کا کوئی دوسرا شاعر یا دانش ور اُن کا حریف نہیں۔ خاکِ مدینہ و نجف کے سرمۂ بصیرت افزا سے اپنی آنکھیں روشن کرنے والے فکرِ اسلامی کے اس اَن تھک مفسّر اور مجدّد نے ملتِ اسلامیہ کی بقا اور اس کی نشأۃِ ثانیہ کے لیے اپنے خیالات ومحسوسات کا ایک ایسا ذخیرہ چھوڑا ہے جسے حوادث کے ابر و باراں اور زمانے کا تیز رو سیلاب کبھی گزند نہیں پہنچا پائے گا۔ اقبال نے کس قدر سچ کہا تھا:

چشمۂ حیوان براتم کردہ اند محرم رازِ حیاتم کردہ اند!
ذرّہ از سُوزِ نوایم زندہ گشت پر گشود و کرمکِ تابندہ گشت
ہیچ کس رازی کہ من گویم نگفت ہمچو فکرِ من دُر معنی نہ سفت
من کہ این شب را چومہ آراستم گرد پایِ ملتِ بیضا ستم
ملتی در باغ و راغ آوازہ اش آتشِ دلہا سرودِ تازہ اش[1]

اپنی کمال دردمندی اور بے مثال مسیحا نفسی کو اپنے کامل ایقان کا حصہ بنا کر اقبال مسلمانوں کی وسیع وعریض سرزمینوں کو لالہ زاروں میں ڈھالنے کے آرزومند ہیں۔ انھیں بلند نگہی، آسماں پروازی اور ''ثریا را گرفتن از لبِ بام'' کا زندۂ جاوید درس دیتے ہیں:

تا کجا در تہِ بالِ دگران می باشی در ہوای چمن آزادہ پریدن آموز!

زخاکِ خویش طلب آتشی کہ پیدا نیست تجلّیِ دگری در خور تقاضا نیست

* صدر شعبۂ اُردو، اورینٹل کالج، جامعہ پنجاب۔

نوای من بہ عجم آتشِ کہن افروخت عرب ز نغمۂ شوقم ہنوز بی خبراست

عرب از سر شکِ خونم ھمہ لالہ زار بادا عجم رمیدہ بو را نَفَسم بہار بادا
نہ بہ جادہ ی قرارش نہ بہ منزلی مقامش دلِ من ، مسافرِ من کہ خداش یار بادا
چو بہ جانِ من در آیی دگر آرزو نہ بینی مگر این کہ شبنمِ تو ، یمِ بی کنار بادا[۲]

اسلام کی حقانیت اور مسلم کلچر کے حیات بخش عناصر، اقبال کے لیے شنیدہ نہیں، دیدہ کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کے وجدان میں ایک طرح سے حاضر و موجود تجربے کی حیثیت سے جَولاں و جنباں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس دینِ متین کی عظمت کو نو بہ نو اسالیب میں اور زندہ اور جیتے جاگتے علائم اور استعاروں کے پیرایے میں بیان کرتے تھے۔ ''بخود خزیدہ و محکم چو کوہساران زی'' کے حیات خیز درس کے پس پشت دینِ اسلام کی سمندر کی سی گہرائی اور وسعت کی حامل ابدیت اور نا قابلِ تسخیر پہاڑوں کی سی صلابت کارفرما تھی۔ اقبال نے صاف لکھا ہے کہ میرے دستِ نغمہ نواز میں کوئی نیا ساز نہیں، وہی دیرینہ چنگ ہے مگر میں اس کے تاروں کو معمول کے مضراب سے نہیں، شیر کے ناخن سے چھیڑتا ہوں کیوں کہ اس ساز کے تار بھی معمول کے تار نہیں بلکہ پتھر کی رگوں سے وجود میں آئے ہیں۔ ذرا دیکھیے مسلم ثقافت کے رنگا رنگ جمال اور اس کے عناصرِ جلال کو کس پُر زور تخلیقی اسلوب میں بیان کرتے ہیں:

بدستِ من ھمان دِیرینہ چنگ است دَرونش نالہ ھای رنگ رنگ است
ولی بنوازمَش با ناخنِ شیر کہ اورا تار از رگ ھای سنگ است[۳]

عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال عجم کا حسنِ طبیعت ، عرب کا سوزِ دَروں

شاید یہاں اس وضاحت کی ضرورت نہیں کہ مذہب اور ثقافت ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں اور بہ قول ٹی-ایس ایلیٹ:

''No culture has appeared or developed except together with a religion.''[۴]

''رموزِ بے خودی'' میں ایک جگہ اقبال نے ''ملتِ محمدیہ'' کے دوام کو آیاتِ قرآنی کے حوالے سے بڑے تخلیقی انداز سے ثابت کیا ہے۔ اس مبحث کا عنوان ''در معنیِ این کہ ملتِ محمدیہ نہایتِ زمانی ندارد کہ دوام این ملتِ شریفہ موعود است'' درج کرنے کے بعد اقبال لکھتے ہیں کہ فرد تو ایک مشتِ گل سے پیدا ہوتا ہے اور قوم کسی صاحبِ دل کے دل سے پیدا ہوتی ہے۔ جب قومیں اپنے اعلیٰ نصب العین ترک کر دیتی ہیں تو موت سے ہم کنار ہو جاتی ہیں۔ رہا یہ سوال کہ ملتِ محمدیہ اور معمول کی اُمتوں میں کیا فرق ہے تو اقبال کا جواب یہ ہے کہ قومیں بھی گوافراد کی طرح ایک متعین عمر گزار کر مر جاتی ہیں مگر امتِ محمدیہ کے مقدر میں حیاتِ ابدی لکھی ہے کیوں کہ اس کے پاس دائمی پیغام کا حامل قرآن حکیم موجود ہے اور

اس امت کا وقتی غروب اس کے ابدی طلوع کا پیش خیمہ ہے:

گرچہ ملت ہم بمیرد مثل فرد از اجل فرمان پذیرد مثل فرد!
امتِ مسلم ز آیاتِ خداست اصلش از ھنگامۂ قالوا بلٰی ست

از اجل این قوم بی پروا ستی استوار از نحن نزّلنا ستی
سطوتِ مسلم بہ خاک و خون تپید دید بغداد آنچہ روما ہم ندید
تو مگر از چرخِ کج رفتار پرس زان نو آئین کہن پندار پرس
آتشِ تاتاریان گلزارِ کیست شعلہ ھای اُو گُلِ دستارِ کیست

شعلہ ھای انقلاب روزگار چون بباغِ مارسَد گردد بہار
درجہان بانگِ اذان بود است و ہست ملتِ اسلامیان بود است و ہست[5]

اسی حقیقت کو اقبال نے اپنی لافانی نظم ''مسجد قرطبہ'' اور ''طلوعِ اسلام'' میں بھی برنگ دگر بیان کیا ہے:

مٹ نہیں سکتا کبھی مرد مسلماں کہ ہے
اُس کی اذانوں سے فاش سرِّ کلیمؑ و خلیلؑ

---

جہاں میں اہل ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے ، اُدھر نکلے ، اُدھر ڈوبے ، اِدھر نکلے

اقبال کی یہ رجائیت، اسلام سے عشق اور ملت محمدیہ کے روشن مستقبل اور حیات نو کی پیش گوئیاں اپنی جگہ مگر سوال یہ ہے کہ تمام قوموں میں سے صرف امتِ محمدیہ کو ابدیت کی سند عطا کر دینا کیا ایک طرح کی ملت پرستی نہیں۔ کیا ملتِ اسلامیہ سے اقبال کا محض جذباتی لگاؤ اس کا محرک ہے؟ پھر اس سے بھی اہم سوال یہ ہے کہ کیا اس عہد میں جب پوری دنیا میں گلوبلائزیشن کا صور شدت سے پھونکا جا رہا ہے۔ مغربی استعمار اپنی قوت اور استکبار کے نشے میں مست پوری دنیا کو یک قطبی نظام کے پنجۂ آہنیں میں جکڑنے کے لیے شدت سے تگ و دو کر رہا ہے۔ اہلِ اسلام کو دہشت گرد، تنگ نظر، ظلمت پسند، بنیاد پرست اور جنگ جو اور خود اسلام کو ''اسلاموفاشزم'' (Islamo fascism) کے القابات دیے جا رہے ہیں اور اسلام سے نام نہاد پیدا کردہ دہشت اور خوف کو اسلاموفوبیا (Islamo phobia) سے تعبیر کیا جا رہا ہے، فوکویاما اور سموئیل ہنٹنگٹن اپنی کتابوں میں مغرب کی لبرل ڈیموکریسی کو نوعِ انسانی کی آخری منزل اور تہذیبوں کے تصادم کو اس کا مقدر قرار دے رہے ہیں۔ جب ہنٹنگٹن یہ کہہ رہا ہو کہ یوریشیا میں تاریخی فالٹ لائنیں زلزلہ آثار ہو کر آتشیں روپ دھار رہی ہیں، افغانستان اور عراق آگ اور خون کا جہنم زار بنے ہوئے ہوں اور ایک ایسی فضا میں جب پوری دنیا **ظھر الفسادُ فی البر و البحرِ** کا عبرت ناک منظر پیش کر رہی ہو، ''اقبال اور اتحاد عالم اسلامی'' جیسے موضوعات پر اصرار اور مذاکرے بے وقت کی راگنی کے مترادف نہیں؟ اور پھر کیا اتحاد عالم اسلامی کی کوئی ٹھوس

صورت ممکن بھی ہے یا اس کی حیثیت مجذوب کی بڑ یا بندگلی کی ہے، ایک خیالی عالم اور نصب العینی یوٹوپیا کی ہے؟ اقبال کے افکار کی روشنی میں یہ سنگین سوال اپنا جواب مانگتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبال کو دینِ اسلام کی عظمت، حقانیت اور ابدیت کا کامل عرفان تھا۔ وہ اس حقیقت سے بھی پوری طرح آگاہ تھے کہ ادیانِ عالم میں صرف اسلام ہی عصرِ حاضر کے تقاضوں سے پورے طور پر عہدہ برآ ہوسکتا ہے اور فرد اور معاشرے کی نفسیاتی، روحانی، فکری، معاشرتی اور علمی ضروریات کو پورا کرسکتا ہے۔ تاریخ اسلام کے عمیق مطالعے نے ان پر اس حقیقت کے اسرار بھی وا کر دیے تھے کہ اپنے عہدِ زرّیں میں اہلِ اسلام نے علم دوستی، خدا شناسی، احترام انسانیت، رواداری اور ایثار کی روشن مثالیں قائم کی تھیں اور تہذیب اسلامی نے یورپ کے عہدِ مظلمہ کو روشنی اور گرمی مہیا کر کے اس کے احیا کے رستے ہموار کیے تھے۔ جس زمانے میں لندن اور یورپ کی تاریک گلیوں میں لوگ گھٹنوں تک کیچڑ اور غلاظت میں دھنس جاتے تھے، صقلیہ اور سپین میں مسلمانوں نے علم و اکتشاف، تمدن، نظام ریاست اور فلسفۂ تاریخ کے چراغ روشن کر رکھے تھے۔ اسلام کے صدر اوّل کی تاریخ نے اقبال کو یہ آگہی عطا کی تھی کہ نبی کریمؐ نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں خطبۂ حجۃ الوداع کے توسط سے نوعِ انسانی کو آزادی اور حقوق انسانی کی حفاظت کا ایک لافانی چارٹر مہیا فرمایا تھا۔ ایک اور موقع پہ ایک عیسائی وفد کے سربراہ کو کمال رواداری سے مسجدِ نبوی میں اجازت مرحمت فرمائی تھی کہ وہ اور ان کے رفقا اپنے دین عیسوی کے مطابق وہاں عبادت کرلیں۔ حضرتِ عمرؓ فتح یروشلم کے بعد بنفسِ نفیس وہاں تشریف لے گئے تھے اور انھوں نے وہاں کے عیسائیوں کو ایک چارٹر کے ذریعے امان مہیا کی تھی۔ اس چارٹر میں یہ لکھا تھا کہ عیسائیوں کو جان اور مال کی آزادی ہے۔ ان کے گرجے اور صلیبیں محفوظ ہیں۔ گرجے عیسائیوں کے تصرف ہی میں رہیں گے۔ انھیں کامل مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ اگر ان میں سے کوئی یروشلم سے مہاجرت کرنا چاہے تو اسلامی حکومت اس کو بہ حفاظت سرحد عبور کرانے کی پابند ہوگی۔ جہاں تک یہود کا تعلق ہے انھیں یورپ کی تمام سلطنتیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ عثمانی ترکوں نے انھیں صدیوں تک تحفظ فراہم کیا۔ ''برطانیہ کی یہود نوازی کے خلاف احتجاج'' کے زیرعنوان ستمبر ۱۹۲۹ء میں تقریر کرتے ہوئے اقبال نے کہا تھا:

> ''ترک یہودیوں کے ساتھ غیر معمولی رواداری کا سلوک کرتے رہے۔ یہودیوں کی خواہش پر انھیں دیوار بُراق کے ساتھ کھڑے ہوکر گریہ وبکا کرنے کی اجازت عطا کی۔ اس وجہ سے اس دیوار کا نام ان کی اصطلاح میں ''دیوار گریہ'' مشہور ہوگیا۔ شریعتِ اسلامیہ کی رُو سے مسجد اقصیٰ کا سارا احاطہ وقف ہے۔ جس قبضے اور تصرف کا یہود اب دعویٰ کرتے ہیں، قانونی اور تاریخی اعتبار سے اس کا حق انھیں ہرگز نہیں پہنچتا۔''[۶]

کیا یہ حقیقت نہیں کہ ۶۲۷ عیسوی سے لے کر ۶۴۷ عیسوی تک کامل بیس سال تک دمشق کی جامع مسجد میں مسلمان اور عیسائی اکٹھے اپنی عبادت کرتے رہے تا آں کہ عیسائیوں نے اپنا گرجا تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا اور کیا یہ حقیقت نہیں کہ دنیا کا قدیم ترین یہودی معبد اب تک دمشق میں موجود ہے۔[۷] یہ ہیں مذہبی رواداری کی وہ چند مثالیں جو آج بھی مسلمانوں اور تمام اقوامِ عالم کے لیے مشعل راہ کا کام دے سکتی ہیں۔

اسلام کو تنگ نظری اور ظلمت پسندی کا مذہب قرار دینے والوں کو یہ بتانا ضروری ہے کہ دینِ اسلام فی الحقیقت کس قدر وسیع النظر واقع ہوا ہے۔ کیا ستم ہے کہ شہرۂ آفاق اطالوی مصنف دانتے اپنے طربیۂ خداوندی میں مجاہد اسلام صلاح الدین ایوبی کو تو بہشت میں جگہ عطا کرتا ہے

مگر ہمارے پیغمبر آخرالزمانؐ کو خاکم بدہن دوزخ (Inferno) میں دکھاتا ہے جب کہ اہلِ اسلام کا اسلام از روئے قرآن اس وقت تک ناقص ہے جب تک وہ انبیائے سابقون اور ان کی کتابوں پر ایمان نہیں لے آتے۔ اقبال نے دانتے کے طرزِ بیہ خداوندی کے طرز پر ''جاوید نامہ'' لکھا مگر اسے اوّل تا آخر پڑھ جایئے، مذہبی رواداری اور کمال وسعتِ نظر کا ایک شاہ کار دکھائی دے گا۔ اس کتاب کے ورق ورق سے مذہبی رواداری اور احترام انسانیت چھلکا پڑتا ہے۔ یہ کتاب امتوں کی مرگ و حیات کے راز بتاتی ہے۔ اِس زندگی افروز رزمیے میں اقبال مختلف افلاک کی جانب پیر رومیؒ کی رہ نمائی میں رہگرا ہوتے ہیں مگر اوّلیں فلک یعنی فلکِ قمر پر پہلی ملاقات مشہور ہندو صوفی وشوامتر سے ہوتی ہے جسے اقبال نے ''جہاں دوست'' کہا ہے اور ''نہ تاخن از عارفِ ہندی'' کے زیرِ عنوان اُس کی زبان سے عارفانہ حقایق کو منکشف کیا ہے۔ چار طواسین کے بیان میں طاسین گوتم، طاسین زرتشت، طاسین مسیح اور آخر میں طاسین محمدؐ کا ذکر آتا ہے۔ یہ ہے مختلف مذاہب اور تہذیبوں کے نمایندوں کا وہ رنگا رنگ منظر نامہ جس سے جاوید نامے کے قصر رفیع کی تعمیر ہوئی ہے۔ اقبال نے دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی تو ایک موقع پر سر ڈینی سن راس نے گفتگو کرتے ہوئے اسلام کے ظہور کی منشائے اصلی کی ان لفظوں میں نشان دہی کی:

> اسلام ڈوگمیٹک (Dogmatic) مذہب نہیں ہے۔ اس کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ نوع انسانی ایک گھرانا اور ایک خاندان بن جائے۔ شعرا اور فلسفی اس اتحادِ نوعِ انسانی محض خواب دیکھتے رہے لیکن اسلام نے اس مقصد کے حصول کے لیے ایک عملی اسکیم پیش کر دی۔ کم از کم دنیائے اسلام رنگ، نسل اور قوم کے امتیازات کو بالکل فنا کر چکی ہے۔ آج دنیا میں اسلام کے سوا اور کوئی ایسا طریق نہیں جس پر کاربند ہو کر یہ امتیازات مٹ سکیں۔ اسلام نے جو فرائض، ارکان یا طریقِ عبادات مقرر کیے ان سب کا مدعا یہ ہے کہ انسانی قلوب کو رنگ، نسل اور قوم کے امتیازات سے پاک کر دے۔''[۸]

اہلِ یورپ کی بدقسمتی یہ ہے کہ انھوں نے اسلام کو رحمت و رافت اور نوعِ انسانی کے لیے ایک بے نظیر نعمت سمجھنے کے بجائے اسے اپنے عہدِ وسطیٰ کے مذہبی تعصّبات کی روشنی میں دیکھا اور دیکھ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بانیِ اسلام اور اسلام کے بارے میں معروضی زاویۂ نگاہ سے یک سر محروم ہیں۔ ایڈورڈ سعید نے اپنی کتاب "Covering Islam" میں بجا طور پر یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا دنیا کے تمام براعظموں میں پھیلے ایک ارب سے زیادہ مسلمان سب کے سب دہشت گرد اور ظلمت پسند ہیں۔ پھر وہ ہم اور وہ یعنی Us اور Them کی لغو ثنویت بلکہ تفریق کا سوال اٹھاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس تفریق کے نتیجے میں Us کا علم بردار خود کو لبرل، روشن خیال، علم دوست اور اعلیٰ تہذیب کا حامل اور Them کو تنگ نظر، جاہل، متعصب اور غیر مہذب قرار دیتا ہے۔ گویا اہلِ مغرب روشن خیال اور ایشیا اور افریقا کے باسی خصوصاً مسلمان تنگ نظر اور ظلمت پسند قرار پائے لہٰذا ان کو مہذب بنانا ضروری ہے یعنی وہی رُڈیارڈ کپلنگ کی Whiteman's Burden کی آزار گوش لغویت!

خرد کا نام جنوں رکھ دیا ، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

نام نہاد مہذب سازی کا عمل جو دراصل استعماریت کے چنگیز خانی چہرے پر اُڑھایا گیا ایک نقاب ہے، اب تک کروڑوں بے گناہ انسانوں کا

خون کر چکا ہے۔ آٹھ کروڑ سرخ ہندیوں کے قتل عام سے لے کر کم وبیش بارہ لاکھ عراقیوں اور افغانیوں کے سفاکانہ قتل اور ابوغریب اور گوانتاناموبے کی ہول ناک خفیہ جیلوں میں انسانیت پر ہونے والے انتہائی بھیانک اور ذلت آمیز تشدد تک، یہ سب مغرب کے مہذب ملکوں کے دامن پر محو اور متلاشی نہ ہونے والا شرم ناک داغ ہے۔ ''پس چہ باید کرد'' میں مغربی تمدن کی اسی سفاکی، بردہ فروشی اور کاروباری ذہنیت کی شدید مذمت کرتے ہوئے اور سادہ دل ملتِ اسلامیہ کو خبردار کرتے ہوئے اقبال نے کہا تھا:

آدمیت زار نالید از فرنگ زندگی ہنگامہ برچید از فرنگ
یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد زیر گردون رسم لادینی نہاد
علم از و رسو است اندر شہر و دشت جبرئیل از صحبتش ابلیس گشت
شرعِ یورپ بی نزاعِ قیل و قال برّۂ را کرد بر گرگان حلال!
گوہرش تف دار و در لعلش رگ است مشکِ این سوداگر از نافِ سگ است
ہوش مندی از خمِ او مَی نخورد ہر کہ خورد اندر ہمین مَی خانہ مُرد
وقتِ سودا خند خند و کم خُروش ما چو طفلانیم و او شکر فُروش
وای آن دریا کہ موجش کم تپید گوہرِ خود را ز غواصان خرید[9]

مغربی تہذیب کی مادہ پرستی، استعماری تگ وتاز اور ''ایں جہانیت'' کے مقابلے میں اقبال مسلم تہذیب کی ہمہ گیری اور انسانیت نوازی کو تمام عمر متنوع اسالیب میں اپنی شعری ونثری تحریروں میں نمایاں کرتے رہے۔ ''پان اسلامزم'' کی اصطلاح کی، جو فرانسیسی صحافت کی شرپسندی کے نتیجے میں وضع ہوئی تھی، تردید کرتے ہوئے اقبال نے ۱۹۳۳ء میں اسلام کے فیض سے مستقبل میں وجود میں آنے والی عالم گیر سلطنت کی پیش قیاسی کرتے ہوئے فرمایا تھا:

> ''اسلام ایک عالم گیر سلطنت کا یقیناً منتظر ہے جو نسلی امتیازات سے بالاتر ہوگی اور جس میں شخصی اور مطلق العنان بادشاہوں اور سرمایہ داروں کی گنجایش نہ ہوگی..... غیر مسلموں کی نگاہ میں شاید یہ خواب ہو لیکن مسلمانوں کا یہ ایمان ہے۔''[10]

ظاہر بات ہے کہ عالم گیر اسلامی سلطنت کا خواب اتحادِ عالم اسلامی کے بغیر ممکن نہیں اور اتحاد عالم اسلامی کے شرایط اور مطالبات اقبال کی نگاہ سے مخفی نہ تھے۔ اس ضمن میں اقبال نے نہ صرف اپنی بے مثال شاعری کے ذریعے بلکہ وقتاً فوقتاً بعض مسلم ممالک کو درپیش مسائل اور مشکلات کے رفع کرنے اور مسلم معاشروں کی اسلام کے محکم اور جاوداں اصولوں کی روشنی میں تعمیرِ نو کرنے کے باب میں تحریری اور تقریری سطح پر بھی بڑی مثبت اور دل سوزی پر مبنی تجاویز پیش کیں۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ کہیں وہ کانپور اور کشمیر کے مظلوم اور آفت زدہ مسلمانوں کے حق میں آواز بلند کر رہے ہیں تو کہیں چینی ترکستان میں برپا ہونے والی شورش، مسئلہ فلسطین، افغانستان، ایران، وسط ایشیا اور اُمتِ عربیہ کے مسائل ومعاملات پر اپنے حکیمانہ خیالات اور مغربی استعمار کی سازشوں اور خود مسلم ملت کے جسد کو لاحق امراض کی نشان دہی کا فرض بجالا رہے ہیں۔

۱۹۳۱ء میں مسلمانانِ لاہور سے خطاب کرتے ہوئے اقبال نے فرمایا:

''تم آج تک اپنی مصیبت کے علاج کے لیے ہزاروں تدبیریں کر چکے ہو۔ اب ایک تدبیر محمد عربیؐ کی بھی آزماؤ۔ حضورؐ فرماتے ہیں اِتّحَادُ اُمَّتِی حُجَّۃٌ قَاطِعَۃٌ۔ ایک دفعہ اتحاد کر کے دیکھو.....اتحاد کامیابی کا سرچشمہ ہے اور حصولِ اتحاد کا راز واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً کی اطاعت میں مضمر ہے۔ اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو۔''[11]

مسلمانانِ لاہور سے یہ خطاب دراصل پورے عالم اسلام سے خطاب اور اس کے لیے ایک نسخۂ شفا کی حیثیت رکھتا ہے۔

اقبال جہاں ایک طرف اسلام کے روشن اور انقلاب انگیز ماضی پر مسرور و شاداں تھے وہیں مسلم ملت کی معاصر صورتِ حال پر ملول و نگراں بھی تھے۔ دیکھیے اپنے عہد کی زوال میں مبتلا حال مست، بیمار ملت کے بارے میں غم و اندوہ میں ڈوبے ہوئے لفظوں میں کس طرح رقم طراز ہیں:

آہ ازان قومی کہ از پا برفتاد　　میر و سلطان زادو درویشی نزاد
از سہ قرن این امتِ خوار و زبون　　زندہ بی سُوز و سُرورِ اندرون
پست فکر و دون نہاد و کور ذوق　　مکتب و ملای او محروم شوق
زشتیٔ اندیشہ او را خوار کرد　　افتراق او را ز خود بیزار کرد
تا نداند از مقام و منزِ لش　　مُرد ذوقِ انقلاب اندر دلش
بندۂ رد کردۂ مولاست اُو　　مفلس و قلّاش و بی پرواست او
گفت دین را رونق از محکومی است　　زندگانی از خودی محرومی است
دولتِ اغیار را رحمت شمرد　　رقص ہا گردِ کلیسا کرد و مُرد[12]

اقبال اپنی استعمار زدہ ملت کو مسلسل خودشناسی، خودانحصاری، ضبطِ نفس، مرکز سے اٹوٹ وابستگی، اعتمادِ نفس اور تیز نگاہی کا سبق دیتے رہے کہ یہی عناصر زندہ قوموں کو وجود میں لاتے ہیں اور یہی زندہ قومیں وحدتِ ملّی کا روپ دھار کر ایک نا قابلِ تسخیر اکائی، ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جاتی ہیں جس سے استعماری قوتیں خوف کھاتی اور لرزہ براندام رہتی ہیں۔ ذرا اقبال کے حکیمانہ ارشادات کے تیور ملاحظہ کیجیے:

نہ کردم از کسی دریوزۂ چشم　　جہان را جز بچشمِ خود ندیدم

---

دلا رمزِ حیات از غنچہ دریاب　　حقیقت در مجازش بی حجاب است
زخاکِ تیرہ می روید ولیکن　　نگاہش بر شعاعِ آفتاب است[13]

---

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا　　نوای زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط وبا موجش در آویز　　حیاتِ جاودان اند رستیز است[14]

---

چیست دین؟ دریافتن اسرار خویش زندگی مرگ است بی دیدار خویش

---

دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گران فرنگ کے احساں سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر[۱۵]

---

قوموں کے لیے موت ہے مرکز سے جدائی ہو صاحبِ مرکز تو خودی کیا ہے ، خدائی!

---

ہر کہ برخود نیست فرمانش روان می شود فرمان پذیر از دیگران

---

ہو اگر قوتِ فرعون کی درپردہ مرید قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللہی

---

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گر باطل بھی تو
یثرب! تو جوہر آئینہ ایام ہے تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے[۱۶]

---

رونق از ما محفل ایام را او رسُل را ختم و ما اقوام را

---

خدمتِ ساقی گری باما گذاشت داد مارا آخرین جامی کہ داشت[۱۷]

اسرارخودی کی اشاعتِ اوّل کے چند برس بعد جب نکلسن نے اس کا انگریزی ترجمہ شایع کیا تو اس پر بعض انگریز مبصروں نے تبصرہ کرتے ہوئے اقبال کو ملت پرست قرار دے کر اس کے خطرناک عواقب کا ذکر کیا۔ یہ ٹھیک وہی اعتراض ہے جس کا ذکر ہم قبلاً کر آئے ہیں۔ اقبال نے اس کے جواب میں نکلسن کو لکھا کہ ان کا مقصود ملتِ اسلامیہ کی عظمت کے بیان سے یہ نہیں کہ وہ دوسری قوموں کی نفی کر رہے ہیں یا یہ کہ وہ جنگ جویانہ عزائم رکھتے ہیں بلکہ یہ ہے کہ نوعِ انسانی کی مستقبل کی جانب پیش قدمی میں اسلام کے رنگ و نسل سے بالاتر تصورات بڑے معاون اور مدد ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا انھی کی بنیاد پر مستقبل میں وحدت عالم انسانی کی صورت ممکن ہے۔ مغربی ممالک میں مریضانہ حد تک پھیلی جغرافیائی وطن پرستی کا علاج ٹائن بی جیسے سربرآوردہ دانش ور بھی اسلام ہی کے تصور انسانیت میں پاتے ہیں۔

اقبال نے اپنے بعض مکتوبات میں بھی کہیں کہیں بعض مسلم ممالک کے استحکام و انسجام کے بارے میں اپنی سوختہ دلی کا اظہار بڑی بصیرت سے کیا ہے۔ ۴ر نومبر ۱۹۲۹ء کو اپنے ایک دوست جمیل کے نام خط میں فرماتے ہیں:

''ازراہ کرم ہمارے اٹک پار کے بھائیوں کی طرف سے جو ذمہ داری ہم پر عاید ہوتی ہے وہ ان حضرات کو یاد

دلایئے۔افغانستان کا استقلال واستحکام مسلمانانِ ہندوستان اور وسطی ایشیا کے لیے وجہ جمعیت وتقویت ہے۔''[۱۸]

ایک خط میں وسطی ایشیا کے ضمن میں پروفیسر محمد اکبر منیر کے نام ایک خط میں انتباہ کرتے ہیں:

''مغربی اور وسطی ایشیا کی قومیں اگر متحد ہوگئیں تو بچ جائیں گی اور اگر ان کے اختلافات کا تصفیہ نہ ہوسکا تو اللہ حافظ ہے۔مضامین اتحاد کی سخت ضرورت ہے۔میرا مذہبی عقیدہ یہی ہے [ کہ ] اتحاد ہوگا اور دنیا پھر ایک دفعہ جلالِ اسلامی کا نظارہ دیکھے گی۔''[۱۹]

ملتِ اسلامیہ کے ماضی، حال اور مستقبل تینوں کے باب میں اقبال کا شعور، اضطراب اور آرزومندی ایک ایسے غیر معمولی طرزِ فکر کی نشان دہی کرتی ہے جس میں شاعرانہ احساس اور کائناتی بصیرت گھل مل کر ایک ہوگئے ہوں۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ عالم اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور وحدت کی آرزو نے اقبال کے پورے وجود کو آتش بجاں کر دیا تھا، ایسی آتش جو خاشاک غیر اللہ کو پھونک کر خاکستر کر دیتی ہے اور ''اپنی مٹی سے عیاں شعلۂ سینائی کر'' کا نعرۂ مستانہ لگاتی ہوئی روشنی، حلاوت اور سوز وسرور سرمدی کا اہتمام کرتی ہے جس سے تاب وتواں حاصل کر کے عشق کے قافلے اپنے نئے، نامختتم اور انوکھے سفر کا آغاز کرتے ہیں اور ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر کی ابدی حقیقت کو الم نشرح کرتے ہیں۔سچ ہے کہ:

سکوں پرستیِ راہب سے فقر ہے بیزار
فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی

اتحاد عالم اسلامی کا وہ خواب جو اقبال اور ان سے پہلے سیّد جمال الدین افغانی نے دیکھا تھا اس وقت تک تشنۂ تعبیر رہے گا جب تک معروضی طور پر اس بات کا کھوج پورے طور پر نہیں لگایا جاتا کہ ماضی میں بڑی بڑی عالمی قوتوں کا قیام، عروج اور زوال کن شرائط کا مرہون اور کن اسباب کا نتیجہ رہا ہے۔علاوہ ازیں جب تک مسلم معاشروں میں بنیادی فکری ثقافتی اور اقتصادی تبدیلیاں رونما نہیں ہوتیں، جہالت کا خاتمہ نہیں ہوتا، وہ وسعتِ نظر پیدا نہیں ہوتی جو مسلمانوں کے دورِ عروج کا طرۂ امتیاز تھی اور اجتہاد کا بند دروازہ وا نہیں ہوجاتا، یہ خواب بے تعبیر رہے گا۔ایک ارب سے زیادہ جمعیت کی حامل دنیائے اسلام آج اپنے اصلی اہداف سے بیگانہ اور اپنے اعلیٰ روحانی اور فکری نصب العینوں سے ہزار فرسنگ دور ہے۔تعداد کثیر ہے مگر معیار پست اور فروتر ہے اقبال نے آزادوں کی عید کو شکوہِ ملک ودیں اور غلاموں کی عید کو فقط ہجوم مومنین سے تعبیر کر کے تعداد ومقدار پر معیار کی برتری کی صداقت کا اعلان کیا تھا۔رسل نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اس نے براعظم آسٹریلیا کے بعض ایسے وسیع وعریض علاقے بھی دیکھے جہاں انسانی آبادی تو ناپید تھی مگر لاتعداد دیمکوں کے گروہ در گروہ دکھائی پڑتے تھے۔رسل کا قول ہے کہ آبادی کی اس غالب اکثریت کی بنا پر دیمکوں کو انسانوں پر برتری نہیں دی جاسکتی۔خاک سے رزق تلاش کرنے والے بالآخر خاک کا رزق ہوجاتے ہیں۔مسلم ممالک کے عیش کوش اور خاک نوش ازدحام کو صحیح معنوں میں ملت میں ڈھلنے کے لیے شب وروز ایک جہادِ عظیم کرنا ہوگا اور اپنے وجود کو لاحق خطرات سے نمٹنے کے لیے اپنی ذات کو اسلام کی ابدی صداقتوں سے ہم آہنگ کرنا ہوگا۔تب جا کر ہی پوری نوع انسانی پر عنقریب مسلط ہو جانے والے یک قطبی نظام کے بالمقابل کھڑا ہوا جاسکتا ہے اور مغرب کے سفاک استعمار کے آگے بند باندھا جاسکتا ہے جو حالت جنگِ سرد میں

۱۹۶۲ء کے آس پاس انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے منصوبوں پر پانچ لاکھ ستر ہزار پاؤنڈ فی منٹ خرچ کر رہا تھا اور جس نے اکیسویں صدی کے پہلے چھے سال میں تین کھرب ڈالر افغانستان اور عراق کی بربادی کی آگ میں جھونک دیے!

خواتین و حضرات! حضرتِ علامہ اقبال ایک فرد نہیں، ایک دبستان تھے، برکت، خیر، صداقت، ایثار، روشنی، حلاوت اور حرارت کا زندۂ جاوید دبستان۔ تاریخ کے ایک خاص موڑ پر مسلم کلچر کی بساط پر اقبال جیسے نابغہ کا ظہور عطیۂ الٰہی کے مصداق تھا۔ اقبال کے نزدیک اسلام نہ تو زمانۂ انحطاط کے خانقاہ نشینوں کے مراقبوں کا تختۂ مشق ہے، نہ واعظوں کا وسیلۂ رزق، نہ ملوکیت کا معین ہے نہ ژولیدہ مو، آشفتہ مغز سیکولر دانش وروں کی پریشاں خیالی کا مؤید بلکہ قم باذن اللّٰہ کی گرمی اور حرارت سے مملو ایک زندہ حقیقت الحقایق ہے جس سے انسانی حیات کے ٹھنڈے چولھے گرم ہوتے ہیں اور دل رزم گہِ حیات میں نئی دھڑکنوں کا امین بنتا ہے۔ باعثِ ننگ ہے ایسے دانش وروں کا وجود جو قلب کے رہزن اور نظر کے ابلیس بن کر دھڑلے سے دن دہاڑے ابنِ آدم کے سکون اور سکینت کے قافلے لوٹ لیتے ہیں اور لایقِ مبارک باد ہے اقبال جیسے رحمتِ ربانی سے الہام یافتہ اربابِ نظر کا وجود جن کے زندہ افکار کے فیض سے انسانیت کو پورے قد سے بڑھنا اور کھڑا ہونا نصیب ہوتا ہے۔

## حواشی

۱- کلیاتِ اقبال فارسی (۱۹۷۸ء)، (شیخ غلام علی اینڈ سنز)، ص ۷، ۱۱

۲- ایضاً، ص ۳۴۹

۳- ایضاً، ص ۱۰۱۵

۴- تفصیل کے لیے ٹی-ایس ایلیٹ کی کتاب *"Notes Towards the Definition of Culture"* (mcmlxv) ملاحظہ کی جاسکتی ہے، Faber and Faber, London۔

۵- کلیاتِ اقبال فارسی، ص ۱۱۸-۱۲۰

۶- گفتار اقبال (۱۹۸۶ء)، (مرتبہ: محمد رفیق افضل)، ادارۂ تحقیقاتِ پاکستان، لاہور، ص ۹۳

۷- *Journey into Islam (Akbar Ahmad)* (۲۰۰۷ء، مطبوعہ پنگوئن، انڈیا) ص ۱۸، ۱۹

۸- گفتار اقبال، بحوالہ سابقہ، ص ۲۳۵

۹- کلیاتِ اقبال فارسی، بحوالۂ سابقہ، ص ۸۳۹، ۸۴۳

۱۰- گفتار اقبال، ص ۱۷۸

۱۱- ایضاً، ص ۱۲۲

۱۲- کلیاتِ اقبال فارسی، بحوالۂ سابقہ، ص ۸۱۹، ۸۲۰

۱۳- ایضاً، ص۲۳۱

۱۴- ایضاً، ص۲۱۵

۱۵- کلیاتِ اقبال اردو (۱۹۸۴ء)، (شیخ غلام علی اینڈ سنز)، ص۴۳۹

۱۶- ایضاً، ص۱۹۲

۱۷- کلیاتِ اقبال فارسی، بحوالۂ سابقہ ص۱۰۲

۱۸- ''اقبال نامہ''، جلد دوم، ص۹۴

۱۹- ایضاً، ص۱۶۳؛ ایسے ہی خیالات کا اظہار اقبال نے برسوں پہلے ۱۹۱۱ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے موقع پر کیا تھا ''میرا اعتقاد ہے کہ ہماری قوم ایک شان دار مستقبل رکھتی ہے اور جو مشن اسلام کا اور ہماری قوم کا ہے وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا۔ شرک اور باطل پرستی دنیا سے ضرور مٹ کر رہے گی اور اسلامی روح آخر کار غالب آئے گی''—— مقالات اقبال، (۱۹۶۳ء)، شیخ محمد اشرف، لاہور، ص۱۴۳

---


## Abstract

*Iqbal (1876-1938) was a great poet and philosopher as well as an idealist and reformer. His poetry and prose are aimed at uniting the Muslim world and establishing the rule of peace and humanity. His works clearly show his ideology and give a message of peace, forbearance and unity among all the segments of the humanity at large. His poetry carries a note of love and affection for all the human beings by accepting the universal principles of Islam. Thus he invites the Muslim world to get together under the flag of faith and devotion and strive hard to bring peace to the whole humanity.*

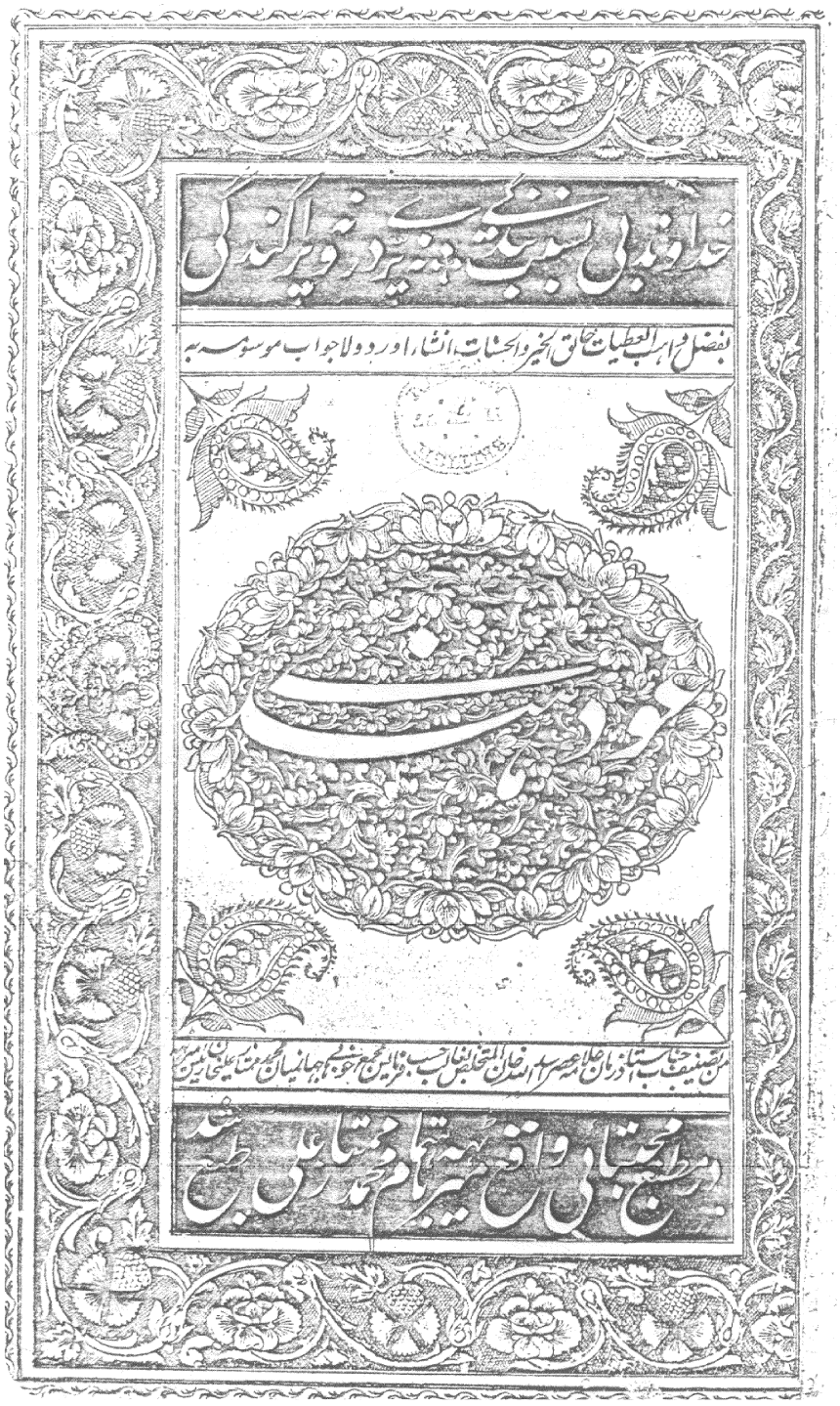

بفضل واہب العطیات خالق الخیر والحسنات انشا اردو لاجواب موسومہ بہ
عود ہندی
در مطبع مجتبائی واقع میرٹھ باہتمام محمد ممتاز علی طبع شد